اداریہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قومی سیرت کانفرنس بعنوان: مکالمہ بین المذاہب کی مذہبی بنیادی، امکانات، فوائد اور تجاویز

رئیس التحریر: مولانا سید نسیم علی شاہ الہاشمی

مورخہ 13.12 جون 2011ء کو وفاقی اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی سیرت کانفرنس بعنوان: مکالمہ بین المذاہب (جس کے لیے محققین کے ہاں بے غبار لفظ مکالمہ بین الادیان ہے) میں شرکت کا موقع ملا۔ افتتاحی نشست کے ساتھ کل پانچ نشستیں ہوئیں اور ہر نشست میں بڑے بڑے اسکالرز اور علماء کرام کی مختلف عنوانات پر تحقیقی مقالہ جات سے سامعین کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔ کانفرنس میں تحقیقی مقالہ جات پیش کرنے والے چند چیدہ شخصیات کے نام درجہ ذیل ہیں:۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد قیصر صاحب وائس چانسلر وفاقی اردو یونیورسٹی، علامہ زاھد الراشدی صاحب، چیف ایڈیٹر ماہنامہ الشریعۃ، سینیٹر ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب، مولانا احمد علی سراج صاحب، پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم صاحب VC کراچی یونیورسٹی۔ ان کے علاوہ چالیس کے قریب سکالرز نے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ کانفرنس میں غیر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

بین المذاہب (بین الادیان) مکالمے کی تاریخ حقیقت میں تو اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جس دن ایک سے زائد ادیان وجود میں آئے۔ البتہ رسمی طور پر کانفرنسوں کی صورت میں اس کی ابتداء بیسویں صدی میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں کا اہتمام بھی ملکی سربراہوں یا حکومتِ وقت کی مدد سے ہوا، لیکن آج تک یہ مکالمے یا کانفرنسیں صرف نیک جذبات یا خواہشات کے اظہار پر ہی اختتام پذیر ہوئیں۔ اور ان کانفرنسوں کے نتیجے میں کوئی عملی اقدام تو کجا ان مکالموں کا مقصد بھی پوری طور پر واضح نہ ہو سکا کہ کیا ان کا مقصد تمام ادیان کے پیروکاروں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سبق دینا ہے؟ تمام ادیان کو حق و سچ تسلیم کرنا ہے؟ ایک دوسرے کے دین میں عدمِ مداخلت کا پابند بنانا یا یہ کہ عالمی سطح پر تمام ادیان کے متفقہ اصول پر مشتمل ایک اور دینِ الٰہی کو تشکیل دینا ہے۔۔۔؟

نیز عالمی سطح پر منعقد کیے گئے ان کانفرنسز کے شرکاء و مدعوین کا اگر صرف اجمالی جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان میں مختلف ادیان کے اکابر یا علماء کے بجائے اہلِ اقتدار یا سیاسی زعماء کی شرکت زیادہ ہوتی ہے اور اگر کچھ شرکت ہوئی بھی ہے تو اسلام (جو کہ دنیا کا ایک بڑا مذہب ہے) کی نمائندگی کے لیے چند ایک مخصوص اسکالرز کے علاوہ کسی بڑے عالمِ دین کی طرف سے شرکت نہیں کی گئی۔ یہیں سے بنیادی تشویش کی ابتداء ہوتی ہے۔ کیونکہ اس حوالے سے ہم ٹاک شوز اور ٹی وی مباحثوں میں تلخ تجربات سے گزر چکے ہیں کہ مختلف موضوعات پر دینِ اسلام کا موقف جاننے کے لیے علمی اعتبار سے کسی کمزور شخص کا سہارا لیا جاتا ہے جو کہ موقع پر اپنی لاعلمی کو باعث عیب سمجھتے ہوئے حدیثِ پاک "فافتوا بغیر علم فضلّوا و اضلّوا" کی مصداق بن جاتا ہے یا اپنے مذہب کا صحیح

دفاع نہ کر سکنے پر اغیار کے اعتراضات کو صحیح ثابت کر دیتا ہے۔

دوسری تشویش جس کا اظہار مذکورہ کانفرنس انتظامیہ کے ایک اہلکار نے اسٹیج پر بھی کیا" کہ ہم نے اس کانفرنس میں غیر مسلم زعماء کو بھی مدعو کیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ یہاں اسٹیج پر مساوی حیثیت سے بیٹھیں، کیونکہ مکالمے کی صحیح فضاء تب بن سکتی ہے جب آپ دوسرے فریق کی اپنے برابر حیثیت کو تسلیم کر لیں"۔ یہی سوچ دیگر اہل ادیان کی ہو سکتی ہے کہ ان مکالموں کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی شناخت اور صرف نام کے مذہب کو دین اور مذہب کی حیثیت سے تسلیم کرانے کے لیے اسلام کے ساتھ اپنا قد کاٹھ برابر دکھائیں۔ اس سے ایک تو مادی زندگی سے تنگ انسانیت کی دیگر مذاہب سے نکل کر اسلام میں داخل ہونے کا سلسلہ کنٹرول ہو جائیگا کیونکہ اس سے تمام ادیان کے صحیح ہونے کا سوچ ابھرے گا۔ دوسرا یہ کہ تمام مذاہب کے درمیان فاصلے کم کرانے کے لیے عقیدہ، اخلاقیات اور ثقافت میں مشترکہ عناصر کی نشاندہی کر کے انہیں اپنانے اور کفر و شرک اور انتہاء پسندی و بنیاد پرستی جیسے اصطلاحات کی نئی تشریح کی جائیں گی۔ تاکہ یہ الفاظ ادیانِ مختلفہ کے درمیان تفریق کا باعث نہ بنیں۔ اس طرح آخر زمانہ کے بعد وحدت ادیان اور تقریب ادیان کے لیے کوشش شروع کر دی جائے گی اور بالآخر ایک اور دین الٰہی وجود میں آجائے گا۔

تیسری قابل تشویش بات کہ ان کانفرنسز میں اس مکالمے کو معاشرے کے ہر انجمن اور طبقے کی سطح تک بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے، یقیناً واہیات پر مبنی اور تحریف شدہ دین کا معتقد تو اس مکالمے میں جو کچھ کہے اس پر تو ہم اعتراض نہیں کر سکتے۔ لیکن انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رہنمائی کرنیوالے اس حقانی اور عظیم مذہب کا ہر پیروکار کجا ہر ہر جزئیہ کی تشریح پر قادر ہے اس طرح رفتہ رفتہ مخلوط عقائد کا حامل معاشرہ تشکیل پائیگا جیسا کہ پاکستان کے صوبہ سندھ کے دیہی علاقوں پر مسلمان اور ہندو ایک پیر سے دعا مانگتے ہیں اور ہندوستان کے اداکار اپنی فلموں کی کامیابی کے لیے مسلم مزارات پر دعا مانگنے حاضری دیتے ہیں۔

چوتھی تشویش یہ کہ ان پروگرامات میں ثقہ اور غیر ثقہ، تجربہ کار اور ناتجربہ کار، جذباتی اور صاحب حکمت علماء رؤساء سب شریک ہوتے ہیں۔ اسلام کے اندر مختلف مسالک کے درمیان انہی مکالموں سے ابتداء ہوتی ہوئی موجودہ فرقہ واریت کی آگ اور جنگ و جدل بن گئی۔ کہ آج اہل تشیع یہودی سے بدتر واجب القتل بن گیا۔ بریلوی مسلک مشرکین مکہ سے آگے مرتبہ کا شرک ہے وغیرہ وغیرہ تو خدشہ ہے کہ یہ مکالمے مذاہب کے درمیان موجودہ درجہ حرارت میں مزید اضافہ کر کے کہیں عالمی جنگوں کا پیش خیمہ نہ بنیں۔

مکالمہ بین المذاہب کے موضوع کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس بارے میں جتنے خدشات پائے جاتے ہیں۔ اتنی ہی اس کی اہمیت ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ میں بہت سے ایسے واقعات موجود ہیں۔ ان میں چند ایک مشہور واقعات میں سے وفد نجران کا مکالمہ ہے جس سے مکالمہ کے آداب کی سبق ملتی ہے۔ اسی طرح میثاق مدینہ میں ایک شرط قابل ذکر ہے جسمیں کہا گیا کہ مدینہ میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذاہب میں آزاد ہوں گے اور ایک دوسرے کے مذہب میں مداخلت نہیں کریں گے۔

آج ایک مخصوص اور طاقتور گروہ اسلام کو تنگ نظر، انتہا پسند، ترقی کے خلاف اور موجودہ دور سے فٹ نہ ہونیوالا ناکام مذہب قرار دے رہا ہے۔ اور اس

سے مزید یہ کہ اقوام متحدہ میں مذہب کو انسان اور معبود کے درمیان انفرادی تعلق اور عقیدت کا نام قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انفرادی واجتماعی دونوں زندگیوں میں اپنے پیروکاروں کے لئے راہ عمل کا تعین کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس تعریف کو بنیاد بنا کر دنیا میں اسلام کے احکام اور حدود سمیت اجتماعی نظام میں اسکی ذرا بھر مداخلت برداشت نہیں کی جا رہی۔ یہاں تک کہ مسلمان کی داڑھی اور حجاب جیسے شناخت تک کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے یورپ سمیت مسلم ممالک تک میں پابندی لگا دی گئی۔ الغرض اسلام ایک محصور مذہب رہ گیا ہے۔ لھذا اس لحاظ سے دفاع اسلام کے لئے با مقصد مکالمے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہ اس مقصد کے لئے چیدہ چیدہ بزرگ علماء کرام جو فقاہت و تجربے کیساتھ عالمی سیاست کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے ہوں، کو ان مکالموں کے لئے نامزد کیا جائے جو دیگر مذاہب والوں کو اسلام کو برداشت کرنے پر آمادہ کریں، کہ اسلام دیگر مذاہب کے برعکس صرف انفرادی اطاعت و عبادت تک محدود نہیں بلکہ انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں میں انسانوں کے لئے احکام وضع کرتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے اپنی ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے۔ اسلامی نظام وخلافت کا یہ مقصد نہیں کہ اس میں صرف اور صرف سر قلم کئے جا رہے ہوں، ہاتھ پاؤں کاٹے جا رہے ہوں یا کوڑے لگائے جا رہے ہوں بلکہ اسلام ایک فلاحی نظام کا دعوی کرتا ہے۔ شریعت کی رو سے" **ادرؤ الحدود ما استطعتم** اور **الحدود تندرئ بالشبهات**" کی روشنی میں قلیل شک کا فائدہ بھی ملزم کو ملتا ہے۔ اور اسلامی نظام مملکت میں اقلیتیں اپنی عبادات میں آزاد اور ان کے مال اور جان کو ایک مسلمان کے برابر تحفظ حاصل ہے۔

ان مکالموں کو ہر عام وخاص طبقے تک نہیں لے جانا چاہئے۔ اور نہ ہی ان کو مغل شہنشاہ اکبر اور سر سید احمد خان کی طرح دین الہی کے قیام یا اہل کتاب اور مسلمانوں میں مشترکہ باتوں کو سامنے لانے اور اسلامی تشخص کو مٹانے کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے، کیونکہ کوئی مذہب دوسرے مذہب میں مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ آیت کریمہ ہے" **ادخلوا فی السلم کافة**" یعنی اسلام میں مکمل داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح ہارورڈ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے استاد سیموئل ہنگٹن کہتا ہے کہ "مذہب خود کو بالکل الگ رکھتا ہے اور یہ بات لوگوں پر واضح ہے کہ ایک شخص آدھا فرانسیسی اور آدھا عربی تو ہو سکتا ہے لیکن کسی شخص کے لئے آدھا کیتھولک عیسائی اور آدھا مسلمان ہونا نہایت مشکل ہے۔

لھذا وفاقی اردو یونیورسٹی کی مذکورہ کانفرنس دیگر مذاہب کے ساتھ مکالموں کے لئے ریہرسل اور مشق کی حیثیت رکھتی ہے۔ کانفرنس میں پیش شدہ مقالات نہایت تحقیقی اور پر مغز تھے۔ اور اگر ان کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کی جائیں تو اہل علم طبقہ اور خصوصا غیر مسلم ممالک کے علماء کے لئے ایک قیمتی ذخیرہ ثابت ہوگا۔

آخر میں کانفرنس کے جملہ منتظمین خصوصاً ڈاکٹر صلاح الدین ثانی اور قاری بدرالدین کو کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اللہ تبارک وتعالی ان کے اس جدوجہد کو اسلام کے دفاع اور سربلندی کے قیام کے سلسلہ میں جدوجہد کارینہ ثابت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔